تبصرہ نگار: پروفیسر محمد اقبال جاوید

زیر نظر کتاب علامہ سید سلیمان ندویؒ کے بارے میں مولانا ابوعلی اثری کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف رسائل و جرائد میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے اور جسے ندوۃ المحدثین گوجرانوالہ نے ۱۹۸۵ء میں جناب ضیاء اللہ کھوکھر کے اہتمام سے طبع کرنے کے بعد، بلا قیمت تقسیم کیا تھا۔ یہ نایاب کتاب اس موضوع پر گوجرانوالا سے طبع ہونے والی پہلی کتاب ہے اور غالباً آخری بھی۔

مولانا عبدالباری (۱۹۰۳ء۔۱۹۹۳ء) جن کا قلمی نام ابوعلی اثری اور ابوعلی اعظمی ہے وہ ۱۹۹۱ء تک دارالمصنفین میں لائبریرین کے طور پر کام کرتے رہے۔ جناب ابوعلی اثری یوں وہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے قدیم ارکان میں سے تھے۔ اور اہل حدیث مکتبہ فکر سے متعلق تھے، جبکہ علامہ سید سیمان ندویؒ بھی تحریک اہل حدیث سے متاثر تھے، اور اس کی دینی افادیت کے دل سے قائل تھے۔ جناب ابواعلیٰ اثری کو دارالمصنفین میں سید مرحوم سے انتہائی قرب حاصل رہا۔ انہیں ایک معتمد اور معاون کی حیثیت حاصل تھی، وہ سید مرحوم کی شخصی، علمی اور دینی اداؤں کے گرویدہ تھے۔ سید صاحب، نجی، تصنیفی اور علمی معاملات میں اُن کے مشوروں کو قدرومنزلت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ یوں ابواعلیٰ اثری "سید سلیمان ندویؒ" کے بارے میں حوالے کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی تحریریں سیّد صاحب کے بارے میں ایک مستند مآخذ ہیں۔

مولانا اثری، شبلی نعمانیؒ کی شخصی نجابتوں کے قائل اور اُن کی قلمی عظمتوں کے گھائل تھے۔ شبلیؒ کے انداز تحریر پر وہ اس قدر فریفتہ تھے کہ انہیں محمد حسین آزاد اور مولانا حالی سے بھی بلند سمجھتے تھے، اس تاثر اور سید صاحب کی رفاقت وصحبت نے ان کے ذہن کو بالیدگی، فکر کو کشادگی، دل کو تازگی اور قلم کو شگفتگی عطا کر دی تھی۔

اُن کی تحریر میں علامہ شبلیؒ اور سید سلیمان ندویؒ کا رنگ انتہائی دل آویزیوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو گیا تھا۔ اُن کے مضامین برصغیر پاک و ہند کے دینی اور ادبی رسالوں میں چھپتے اور اہل

ذوق کے لئے سرمایہ شوق فراہم کرتے رہے، محترم ضیاء اللہ کھوکھر ذوق و شوق کے اسی علمی قافلے کے فرد فرید ہیں۔ وہ جماعتی وابستگی کے ساتھ مولانا اثری کے انداز تحریر سے بھی انتہائی متاثر تھے، اسی تاثر کا نتیجہ تھا کہ وہ اُن کی تحریروں کو نہ صرف پڑھتے رہے بلکہ محفوظ بھی کرتے رہے۔ یہی وہ تعلق خاطر تھا جو انہیں ۱۹۸۴ء میں گوجرانوالہ سے دارالمصنفین اعظم گڑھ لے گیا، وہاں انہوں نے مولانا اثری سے ملاقات بھی کی اور اس امر کی پیش کش بھی کی کہ وہ اُن کے اُن مضامین کو کتابی شکل دینے کی سعی کریں گے جو علامہ سید سلیمان ندویؒ سے متعلق ہیں۔ ۱۹۸۵ء وہیں گوجرانوالہ سے شائع ہونے والی زیر نظر کتاب، اسی وعدے کا ایک خوبصورت ایفاء ہے، انہوں نے اس تالیف کو بلاقیمت رکھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی تالیف ہاتھوں ہاتھ نکل جاتی ہے اور یوں جلد کمیاب اور نایاب ہو جاتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ تالیف ریکارڈ پر آئے اور ریکارڈ میں رہے۔

اس کتاب کا انتساب مولانا ابوعلی اثری ہی کے قلم سے ہے:

انتساب

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اپنے تاثراتی مضامین کے اس مجموعہ کو جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ کے نام معنون کرتا ہوں، جو علامہ سید سلیمان ندوی کے علوم و معارف کے قدردان، ان کے ادب و انشاء کے پرستار، ان کے اسلوب و طرز نگارش کے کامیاب مقلد، دارالمصنفین میں ان کے جانشین، اور شبلی و سلیمان کی ادبی و علمی روایات کے امین ہیں۔

خاکپائے سلیمان

ابوعلی

اس کتاب میں جو مضامین شامل ہیں وہ سب مختلف مجلات میں شائع ہو چکے ہیں۔ مضمون اشاعتی معلومات کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں۔

سید سلمان ندوی کا ایک خط میرے نام

مولانا سید سلیمان ندوی کی بارگاہِ علم ودانش میں۔ سب رس حیدرآباد ی ۱۹۶۹ء

تحریک حیاتِ سلیمان۔ ہماری زبان دہلی، ۱۵ مارچ ۱۹۷۶ء

سید الملک۔ صدق جدید لکھنو، ۲۵ جنوری ۱۹۵۷ء

معارف سلیمان نمبر پر ایک نظر۔ الجیب پھلواری اکتوبر ۱۹۷۴ء

معارف سلیمان نمبر

حیاتِ شبلی۔ الجیب پھلواری ستمبر ۱۹۷۴ء

خلاصہ حیاتِ شبلی۔ فاران کراچی، فروری ۱۹۶۴ء

حیاتِ شبلی اور مولانا سہیل۔ فاران کراچی اگست ۱۹۵۷ء

مولانا وحید الدین خاں اور حیاتِ شبلی

سیرۃ النبی ﷺ۔ احتساب علی گڑھ، مارچ ۱۹۸۱ء

حیاتِ شبلی کے ناقدین۔ تحریک اکتوبر ۱۹۷۴ء

جانشین شبلی۔ فاران کراچی، جون ۱۹۵۹ء

مولانا شبلی کی نگاہ جوہر شناس اور تکمیل سیرت۔ سب رس حیدرآباد جون ۱۹۷۶ء

سید سلیمان ندوی۔ نقش دیوبند جولائی اگست ۱۹۵۹ء

مولانا سید سلیمان ندوی کے علمی وتاریخی کارنامے۔ برہان دہلی مئی ۱۹۴۰ء

علامہ سید سلیمان ندوی مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر میں۔ فاران اکتوبر ۱۹۵۹ء

۱۴ اگست ۱۳ء کا اداریہ مشہد اکبر نمبر ا، فاران کراچی

سیرت عائشہؓ۔ سب رس حیدرآباد ۱۹۷۲ء

مولانا سید سلیمان ندوی اور ان کی سیرت عائشہؓ۔ الجیب پھلواری اپریل ۱۹۷۳ء

خیام۔ فاران کراچی

ایجوکیشنل کانفرنس اور مولانا سید سلیمان ندوی۔ کانفرنس گربوٹ یکم مارچ ۱۹۷۵ء

مولانا سید سلیمان ندوی کا قیام پاکستان۔ صدق جدید لکھنؤ ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۶ء

مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا تھانوی کے بعض نامور خلفاء۔ صدق جدید لکھنؤ ۹ جون ۱۹۷۶ء

معترضین اسلام اور سید صاحب۔ فاران مئی ۱۹۷۶ء

مولانا سید سلیمان ندویؒ اور تحریک اہلحدیث۔ منہاج جون ۱۹۵۸ء

سید صاحب کے اہلحدیث احباب۔ منہاج لاہور ۱۷۔۲۱، ۲۸ جون ۱۹۵۸ء

حیات سلیمان کا ایک گم شدہ ورق۔ ترجمان دہلی اگست ۱۹۷۰ء

مولانا سید سلیمان ندویؒ اور علمائے اہلحدیث

اب اس تالیف کے کچھ اقتباس دے رہا ہوں، مختلف موضوعات پر لکھے گئے مضامین میں سے کچھ نثر پارے محفوظ کرنا چاہتا ہوں اور مقصد یہ ہے کہ ان بکھرے شذرات میں ایک معنوی تسلسل آجائے، تاکہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے شخصی انوار اور علمی افکار کی ایک مربوط سی جھلک دکھائی دے سکے۔

ترے عکسوں پہ گویا آج بھی ہے دسترس میری
یہ جب شیشے میں آتے ہیں مری تحریر بنتے ہیں

مولانا سید سلیمان ندویؒ کو اپنی گوناگوں علمی مشاغل اور اسفار کی وجہ سے جو زیادہ تر دین اور علم کی خدمت کے لئے ہوتے تھے، اگرچہ حدیث کی براہ راست خدمت کا موقع نہیں ملا اور نفس حدیث پر ان کی کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔ لیکن ان کی ساری تصانیف سیرۃ النبی ﷺ، سیرت عائشہؓ، خطباتِ مدراس، رحمتِ عالم ﷺ حدیث ہی سے ماخوذ اور مستنبط ہیں۔ سیرت عائشہؓ کی تالیف کے وقت، مولانا شبلی نے سید صاحب کے لئے حیدرآباد سے علامہ جلال الدین سیوطی کا حدیث میں ایک نایاب رسالہ عین الاصابہ پہنچایا تھا، جو کتب خانہ میں بہت خراب وخستہ حالت میں اب تک موجود تھا۔ انہوں نے سیرت عائشہؓ کا دوسرا ایڈیشن کچھ اور معلومات اور مزید حواشی کے ساتھ نہایت اہتمام سے شائع کیا تو اس رسالہ کو باقاعدہ ایڈٹ کرکے بطور ضمیمہ کے اس کے

ساتھ شامل کرلیا اور افادۂ عام کے خیال سے اس کے کچھ مزید فرمے بھی چھپوائے۔ اس طرح انہوں نے ایک گمنام اور نایاب مجموعہ حدیث کو پردہ گمنامی سے منظر عام پرلا کر وقف عام کردیا، جو شائقین وطلبہ حدیث کے لئے

ایک نعمت غیر مترقبہ ہے، یہ کل ۱۸ صفحوں کا مختصرترین رسالہ ہے، اس میں وہ حدیثیں جمع کی گئی ہیں جن میں حضرت عائشہؓ نے اپنے معاصرین سے اختلاف کیا ہے، ایسے تمام مسائل جن میں حضرت عائشہؓ کی کچھ رائے تھی، اور دوسرے صحابہ کی کچھ سید صاحب نے سیرۃ عائشہؓ میں جمع کردیا تھا۔

اَرض القرآن اور سیرتِ عائشہؓ جیسی گراں مایہ اور محققانہ تصانیف کے بعد سید صاحب کا عظیم الشان کارنامہ مولانا شبلی کی ناتمام سیرت کی تکمیل ہے، مولانا شبلی نے اس مقدس کام کو اپنی آخر عمر میں شروع کیا تھا، اور اس کی تکمیل کو اپنے خاتمہ بالخیر ہونے کا ذریعہ بنانا چاہا تھا، فرماتے ہیں:

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم ﷺ
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

لیکن افسوس اپنی آرزو کے مطابق اس مقدس کام کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے، اس کی ایک ہی جلد لکھی تھی کہ خود ان کی کتاب زندگی کا ورق آخر ہوگیا اور اس کی حسرت اپنے ساتھ لے گئے، سید صاحب نے اُستاذ کے اس ناتمام کام کی جس طرح تکمیل کی اور جس تلاش وتحقیق کے ساتھ اس کی چار جلدیں یکے بعد دیگرے مرتب کیں، وہ ان کی زندگی کا بڑا شاندار کارنامہ ہے۔ پہلی جلد گو بظاہر مکمل تھی، لیکن اس کے اجزاء بے حد منتشر تھے، ان کا جمع کرنا اور پھر مرتب کرنا بھی ایک مستقل تالیف کا کام تھا، اور وقت طلب بھی، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس کے تمام منتشر

اجزاء کو نہ صرف قرینہ سے جمع کیا بلکہ اس میں جو مباحث تشنہ تکمیل تھے۔ ان کو مزید غور وفکر اور تلاش وجستجو اور تحقیق وتدقیق سے پورا کیا، جو حواشی نامکمل تھے ان کو مکمل کیا اور جو رہ گئے تھے ان کو از سر نو لکھا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ بھی مولانا شبلی کی طرح یورپ کے مستشرقین اور ہندوستان کے تنگ نظر اور متعصب مورخوں کے اعتراضات کا دفاع اور ان کی تردید کرتے رہے، اور اپنے رفقاء سے بھی ان کے رد میں مضامین لکھواتے رہے۔ جن سے معارف کی فائلیں بھری ہوئی ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی مستشرقین یورپ اور ہندوستان کے تنگ نظر مورخوں کے اعتراضات اور الزامات پر خاص نظر رہتی تھی، اور ہاتھ کے ہاتھ ان کے جوابات دینے کی کوشش کرتے تھے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے الہلال سے علیحدہ ہو جانے کے بعد پونہ فرگوسن کالج میں پروفیسری قبول کرلی تھی، جس کو مولانا ابوالکلام آزاد نے ان کی فطری صلاحیتوں کی بنا پر ان کے لئے کچھ زیادہ مناسب نہیں سمجھا لکھتے ہیں:

> آپ نے پونہ میں پروفیسری قبول کر لی، حالانکہ خدا نے آپ کو درس وتعلیم مدارس سے زیادہ عظیم الشان کاموں کے لئے بنایا ہے۔ خدا کے لئے میری سنئے اور مجھے اپنا ایک مخلص بھائی تصور کیجئے، میں آپ کی عزت کرتا ہوں اور خدا شاہد ہے کہ آپ کی محبت اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ کیا حاصل اس سے کہ آپ نے چند طالب علموں کو فارسی، عربی سکھلا دی، آپ میں وہ قابلیت موجود ہے، کہ آپ لاکھوں نفوس کو زندگی سکھلا سکتے ہیں۔

جب مولانا سید سلیمان ندویؒ پاکستان میں خواہش، آرزو اور تمنا کے خلاف مستقل قیام پر مجبور کر دیئے گئے، تو طرح طرح کے علمی منصوبے ان کے دل میں پیدا ہوئے، سر دست دیوبند، ندوۃ، دارالمصنفین، مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ کا بدل پیدا کرنا آسان کام نہیں تھا، تسید

صاحب نے اپنی تسکین کے لئے مکتبہ الشرق کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ، اپنی نگرانی میں قائم کیا، اگر مولانا سید سلیمان ندویؒ کی زندگی نے وفا کی ہوتی تو کیا عجب تھا کہ یہ آگے چل کر دارالمصنفین میں تبدیل ہو جاتا اس ادارہ سے خود انہی کی دو کتابیں شائع ہوئیں، ایک ان کے سفر یورپ کے زمانہ کے خطوط کا مجموعہ برید فرنگ کے نام سے دوسری یادرفتگان جس میں ان کے وہ مضامین ہیں، جو انہوں نے اپنے سے تعلق رکھنے والے ہندوستان کے ہر طبقہ زندگی کے مشاہیر و داعیان کی وفات پر لکھے تھے۔

۶۷ برس کی عمر کو پہنچے تھے کہ پیام اجل آ پہنچا اور وہ راہی ملک بقا ہو گئے۔

درج بالا اقتباسات سے پتا چلتا ہے کہ ان کا انتقال ہوا تو بھارت میں مقیم متعلقین کے غم واندوہ کا کیا عالم تھا اور بطور تقابل وعبرت ''مقالات راشدی'' (از سید حسام الدین راشدی، ناشر جامعہ کراچی، انسٹی ٹیوٹ آف سینٹرل اینڈ ویسٹ ایشین سٹڈیز) میں سے ایک اقتباس دینے کی ہمت کر رہا ہوں کہ وہ جب کراچی تشریف لائے تو اہل شہر کے تپاک کا کیا عالم تھے اور جب ان کی آنکھیں بند ہوئیں تو اس دیس کے باسیوں نے کیسے ان سے آنکھیں پھیر لیں، کاش، ہم لوگ صاحب دل اور صاحب نظر لوگوں کی قدر کرنا سیکھیں، استقبال کی رسم ادا کر کے انہیں تنہائی، عزت اور کس مپرسی کے سپرد نہ کریں اور ان کے جانے کے بعد انہیں قلم قلم اور قدم قدم یاد رکھیں اور ان کے نقوش پا سے علمی، ادبی اور فکری چاندی سمیٹتے رہیں کہ ایسے ہی دیئے سے دیا جلتا ہے۔

افسانہ ہائے عشق کا عنوان تھا میرا نام میں زیب داستاں تھا ابھی کل کی بات ہے
وہ کاروان شوق جو رستے میں لٹ گیا میں اس کا اک نشاں ہوں مجھے یاد کیجئے
اک حرف دل نشیں ہوں مجھے بھولئے نہیں آواز دوستاں ہوں مجھے یاد کیجئے

اب سید حسام الدین راشدی کی مذکورہ بالا تحریر دیکھیں، اس میں سید صاحب کے ساتھ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا تذکرہ بھی ہے کہ ایک ہی جگہ دونوں عظمتوں کے مرقد ہماری فراموشگاریوں کے شکوہ سنج ہیں۔

ایک دن میں نے کراچی کی دیواروں پر قدآدم پوسٹر دیکھا کہ:

''سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا لکھنے والا کراچی کو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے مشرف فرمارہے ہیں! کراچی والوں کو چاہئے کہ لاکھوں کی تعداد میں ان کے استقبال کو کراچی کینٹ پہنچیں۔

شہر میں بڑی گھما گھمی تھی کہ سید سلیمان ندویؒ ہندوستان کو خیر باد کہہ کر اس اسلامی مملکت میں رہنے اور بسنے کے لئے تشریف لارہے ہیں۔

لالہ بھیم سین سچر کی قیادت میں ''پھر بساؤ کمیٹی'' کے ممبران بھی دلّی سے آرہے تھے۔ ہم لوگ ان کو لینے جب اسٹیشن پہنچے تو واقعی پورا پلیٹ فارم اسلامیانِ پاکستان سے اٹا ہوا تھا۔

معلوم ہوا کہ سید سلیمان ندویؒ بھی لاہور سے اسی گاڑی سے تشریف لارہے ہیں۔ جب گاڑی رکی تو ہم ''پھر بساؤ کمیٹی'' کی طرف لپکے۔لوگوں نے بھی اسی طرف آنا شروع کیا۔ اللہ اکبر کے نعرے فضا میں گونج اُٹھے اور پھولوں کے ہار بھیم سین سچر اور ان کے ساتھیوں کے گلے میں ڈالے گئے۔ کمیٹی والے خوش ہوگئے کہ یہ پوری پاکستانی مخلوق ان کے استقبال کے لئے سر کے بل چل کر اسٹیشن پر پہنچی ہے، اور خدا کا شکر ہے کہ انہیں آخر دم تک یہی غلط فہمی رہی۔ حقیقت یہ تھی کہ سید صاحب کسی وجہ سے نہ آسکے۔ پھر بساؤ کمیٹی کے لئے استقبال کنندہ ہم پندرہ بیس آدمی تھے۔ کمیٹی والے غلط فہمی میں رہے اور ہم اندرون خانہ ان استقبال کنندگان کی موجودگی اور ان کے ہاروں سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر بہت خوش ہوئے تھے۔ اسے اتفاق کہئے یا سوءِ اتفاق، بہرحال! ہمیں تو وقت پر بڑا کام دے گیا۔

جب سید سلیمان ندویؒ صاحب تشریف لائے تو میرے قریب ہی ایک کوٹھی میں قیام فرمایا۔ یہ وہ دور تھا جب کہ لوگوں کو اُمید تھی کہ پاکستان میں اسلامی حکومت کا دستور بننے والا ہے اور اس کے کمیٹی کے سربراہ سید صاحب ہوں گے۔ مسلمان کی یہ خصوصیت ہے کہ ہر سربراہ سے فوراً عقیدت اور مروت پیدا کرلیتا ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کسی کی شخصیت اور شخصی

وجاہت کی بنا پر معتقد یا متاثر ہوتے ہوں۔ لوگ درحقیقت اپنی ذاتی اغراض نکالنے کے لئے گردوپیش کے چکر کاٹتے رہتے ہیں اور حقیقی عقیدتمند کم ہوتے ہیں۔ یہی حال سید صاحب کا بھی لوگوں نے کیا۔ میں نے سنا اور دیکھا بھی کہ سید سلیمان ندویؒ کی کوٹھی پر ہر وقت ٹھٹ کے ٹھٹ لگے رہتے تھے۔ ان دنوں شاید ہی سید سلیمان ندویؒ کو اپنے گھر میں آنے، آرام کرنے اور سوچنے کی فرصت ملتی ہوگی۔

غرض کہ ایک زمانہ اس امید پر لوگوں کا بیت گیا کہ سید سلیمان ندویؒ سربراہ اب بنے اور کل بنے۔ جب ایک دفعہ اقتدار کے دروازے سید سلیمان ندویؒ پر وا ہوئے تو پھر ان تمام فرضی عقیدت کیشوں کے کاج سدھ ہوتے رہیں گے۔ لمبے عرصے تک آنے جانے والوں کے ذہنوں اور عقائد میں یہی کش مکش رہی اور اسی آس پر انہوں نے آمدورفت جاری رکھی، لیکن یہاں تو نہ اسلامی دستور کی طرف توجہ ہوئی اور نہ سید سلیمان ندویؒ کسی ایسے محکمے کے سربراہ بنے۔ حکومتی حلقوں میں سید سلیمان ندویؒ کی آمدورفت نہیں تھی۔ آخر خدا خدا کر کے یہ جھمگٹا اور جھرمٹ کم ہوتے ہوتے ختم ہوگیا اور فقط وہی لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے جو واقعی ان کی علمی فضیلت اور منزلت کی وجہ سے ان کی ذات والا صفات سے حقیقی تعلق رکھتے تھے۔

نظامی دواخانے والے میرے محترم شفیق حکیم نصیرالدین احمد ندوی کا خدا بھلا کرے جنہوں نے روزِ اوّل سے سید صاحب کے دم توڑنے تک ان کی خدمت اس دل سوزی سے کی کہ وہ انسانیت کے بلند مراتب پر تو بفضلہٖ تعالیٰ فائز ہی ہیں لیکن اس سے جبکہ سید سلیمان ندویؒ پر آخری وقت آیا تو وہ واقعی ملائک معلوم ہوتے تھے۔ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا، ان کی آنکھوں میں آنسو کی نمی تھی اور دل میں ایک کراہ، ذہن میں بے پناہ کش مکش، اضطراب اور اذیت تھی اور اسی عالم میں وہ خدمت اور علاج برابر جاری رکھے ہوئے تھے۔

ایک دن صبح سویرے مولانا عبدالرشید نعمانیؒ گھبرائے ہوئے میرے پاس آئے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

جلد اُٹھو! سید سلیمان ندویؒ کے جنازے کی نماز میں شرکت کریں۔

میرے منہ سے چیخ نکل گئی، کھل کر تو نہیں رویا لیکن اندر ایک طوفان برپا ہو گیا اور آنکھوں کے سامنے پاکستان کی پوری فضاء تاریک اور بھیانک دکھائی دینے لگی۔

نیوٹاؤن جامع مسجد کی بنیادی عمارت تو مکمل ہونے کے قریب تھی، لیکن ایوان میں فرش ابھی تک نہیں ہوا تھا، مولانا کا جنازہ رکھا ہوا تھا، کچھ عزیز، کچھ اہل علم اور ایک دو عرب سفراء موجود تھے۔ دو صفیں غالباً بڑی مشکل سے ہوئیں اور ہم نے سیرت رسول ﷺ کے لکھنے والے کی نماز جنازہ پڑھی۔

پاکستانی مسلمان کے مزاج کی دونوں کیفیتیں اس وقت میرے ذہن میں اُبھر آئیں۔ ایک آنے کے وقت ہزاروں کی تعداد میں اسٹیشن پر جمع ہونا اور یہ کہ دائمی مفارقت کے وقت اس طرح آنکھیں چرا جانا

زراہ میکدہ، یاراں! عنان بگردانید
چراکہ، حافظ ازین راہ رفت و مفلس شد

پاکستان اسلامی حکومت کا روپ دھار کر وجود میں آیا تھا۔ لیکن دستور سے پہلے شیخ الاسلام کا منصب قائم کرنا ضروری تھا۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ مرحوم و مغفور اس وقت کی حکومت میں بڑی دسترس رکھتے تھے۔ دستور ساز اسمبلی کے ممبر بھی تھے، حکومت کی طرف سے تو غالباً نہیں لیکن مسلمانوں کی طرف سے وہی شیخ الاسلام قرار پائے اور پکارے جانے لگے۔ اتفاق سے وہ بھی میرے ہی محلے میں جب تک زندہ رہے، ایک صاحب کی کوٹھی میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے فروکش رہے، میزبان کی آنکھیں تو فرش راہ تھیں ہی لیکن اور عقیدت مند بھی کچھ کم نہیں تھے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی خدمت میں افسوس ہے کہ میں فقط ایک ہی مرتبہ جا سکا اور وہ بھی مولانا غلام رسول مہر کے ہمراہ۔ ان دونوں کے مابین اسلامی دستور پر باتیں ہوتی رہیں۔ میں سنتا رہا لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ جب مولانا مہر باہر نکلے تو وہ بھی کچھ متردد اور مذبذب

معلوم ہوتے تھے۔ بہرحال اس کے بعد پھر کبھی مجھے توفیق نہ ہوسکی کہ ان کی خدمت میں حاضری دے سکوں۔

بہت سی باتیں اور حقائق ایسے ہوتے ہیں جو کہنے کے لئے نہیں ہوتے، وقت اور مصلحت کوشی کا خدا بھلا نہ کرے بلکہ بیڑا غرق کرے، جس نے انسان کا یہ ازلی حق چھین رکھا ہے۔ بہرحال! جہاں یہ ''مہمانِ خصوصی'' قیام پذیر تھے اس کے سامنے بہت بڑا میدان خالی پڑا ہوا تھا۔ یہ وہی میدان ہے جہاں آل انڈیا کانگریس کا اجلاس ہوا تھا اور مولانا ظفر علی خاں نماز کے وقت اجلاس ملتوی کرنے کی بات پر گاندھی جی سے ناراض ہوکر نہ فقط واک آوٹ کر گئے بلکہ اسی رات کولاہور چلے گئے تھے۔ جب یہ ''مہمانِ خصوصی'' اس جہان سے رخصت ہوئے تو اسی میدان کے دورافتادہ کونے میں سپردِ خاک کئے گئے۔ اس میدان میں شیخ الاسلام کی زندگی میں ایک چھوٹی سی مسجد بنالی گئی تھی۔ مولانا سپردخاک کئے گئے اور جب یہ سب کچھ ہوچکا تو بقیہ میدان میں اسلامیہ کالج کی اتنی بلند و بالا اور شاندار عمارت کھڑی کی گئی کہ مولانا کا مزار اور خدا کا گھر دونوں اس کے سائے تلے نہ فقط دب کے رہ گئے بلکہ ایک کھیل معلوم ہونے لگے۔

اس غیراہم گوشے میں دو مزار ہیں، ایک شیخ الاسلام کا اور اس کے پہلو میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کا۔ یہ گوشے اس طرح ویران اور اُداس سے ہیں کہ دن کی دوپہر کو بھی وہاں شام غریباں کا ساسماں نظر آتا ہے۔ دعائے مغرفت کے لئے ممکن ہے کوئی بھولا بھٹکا بندۂ خدا آتا ہو، لیکن جب بھی میں وہاں سے گزرا ہوں تو ان دونوں قبروں کو کچھ اس طرح اُجاڑ اور ویران پایا ہے کہ جیسے یہ قبریں ایسے دو نامعلوم مسافروں کی ہوں جن کا نہ وطن معلوم ہو اور نہ اس دنیا میں کوئی ان کا اور وارث ہو۔ نہ جانے یہ دو غریب الدیار کن امیدوں کے ساتھ اپنے آباؤ اجداد کے قبرستان کو تج کر یہاں پہنچے تھے اور نہ جانے پھر کیا ہوا کہ آج ان کے مزاروں کی یہ صورت ہے۔ بہرحال! آئندہ آنے والی نسلوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان دو مزاروں کے اندر اس صدی کے دو ایسے نادر روزگار نامی فردوس نشیں ہیں جن میں سے ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو اُجاگر کرنے